جلد : ۷۳ شمارہ: ۱۲

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اپریل ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

شریواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ	اپنی بات	۲
خراج عقیدت	ڈاکٹر امبیڈکر؛ ایک عہد ساز شخصیت ..... رباب رشیدی	۳

گوشۂ قاضی عبدالستار

(افسانہ) پیتل کا گھنٹہ	قاضی عبدالستار	۶
نظام زمینداری کا بیانیہ 'شب گزیدہ'	صبا رحمن	۹
قاضی عبدالستار کا فن	شہباز عالم	۱۳
قاضی عبدالستار کی افسانوی دنیا پر ایک نظر	ناز مین	۱۷
شب گزیدہ کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر شبنم رضوی	۲۲

گوشۂ اقبال مجید

(افسانہ) میراث	اقبال مجید	۲۵
اقبال مجید کے افسانے 'اضطراب' کا تجزیہ	پروفیسر شارب ردولوی	۲۹
عشق بن یہ ادب نہیں آتا	پروفیسر علی احمد فاطمی	۳۲
اقبال مجید؛ اردو فکشن کی مستحکم آواز	ڈاکٹر عابد حسین حیدری	۳۸
اقبال مجید اور ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ	ڈاکٹر اطہر مسعود خان	۴۳

گوشۂ ارشاد امروہوی

(افسانہ) گونگا درد	ارشاد امروہوی	۴۹
دہلیز کی خوشبو کی زمانی آواز	ڈاکٹر ریحان حسن	۵۲
ارشاد امروہوی بحیثیت افسانہ نگار	ڈاکٹر محمد ظفر حیدری	۵۶
لفظوں کی گنجان بستی کا باشندہ؛ ارشاد امروہوی	ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق	۶۰
لکھنؤ کی شامِ زوال کا قصہ گو؛ ارشاد امروہوی	شاہد کمال	۶۴

گوشۂ شمیم نکہت

(افسانہ) سوال	شمیم نکہت	۷۱
ہمارے شے آپا	ڈاکٹر ترنم ریاض	۷۴
پروفیسر شمیم نکہت؛ گہوارۂ علم وادب	ڈاکٹر جلال اصغر فریدی	۷۷
شمیم نکہت کا احتجاجی لہجہ	شہناز رحمٰن	۸۰
پروفیسر شمیم نکہت بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر پروین شجاعت	۸۴
رنگ ونکہت کی قبا میں علم وفن کا ذکر ہے	ڈاکٹر زیبا محمود	۸۸
شمیم نکہت کے افسانوں میں تانیثی افکار	ڈاکٹر تسنیم بانو	۹۱

غزلیں

غزلیں	ڈاکٹر راکیش ورماراہی	۹۵
غزلیں	کاظم جرولی، ضیاء فاروقی	۹۶

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

CamScanner

اقبال مجید : اردو فکشن کی مستحکم آواز

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

پرنسپل ایم جی ایم پی جی کالج
سنبھل

رابطہ: 9411097150

اردو فکشن کی تاریخ میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور منٹو وغیرہ کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل آتی ہے۔ ان میں اقبال مجید امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوری آن بان کے ساتھ فکشن کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی ذہانت اور اختراعی صلاحیت سے جلد ہی ایک مستحکم جگہ بنالی۔

علاقۂ روہیل کھنڈ کا یہ مایہ ناز سپوت جس کی ابتدائی تعلیم مراد آباد میں ہوئی اور گریجویشن لکھنؤ یونی ورسٹی سے کیا بعدہٗ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی ایڈ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں اولاً اورئی ضلع جالون کے گورنمنٹ کالج میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ بحیثیت استاد سیتاپور میں بھی گورنمنٹ کالج میں خدمات انجام دیں۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں پروڈیوسر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور ۱۹۹۲ء میں اسی شعبۂ سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔

سبکدوشی کے بعد مدھیہ پردیش حکومت نے ان کا تقرر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے سکریٹری کے عہدے پر کیا اور انہوں نے اس عہدے پر رہ کر اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اقبال مجید جہاں اردو کے مایہ ناز فکشن نگار ہیں۔ وہیں وہ ایک کامیاب مترجم اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کے بہت سے ڈرامے مختلف جگہوں پر کھیلے گئے۔ 'کتے'، 'چاندی کا زہر'، 'جرم اور سزا' اور 'تکیہ' ان کے مشہور و مقبول ڈرامے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی ان کے کئی ڈرامے اور فیچر نشر ہوئے جو کافی پسند کئے گئے۔ بھوپال گیس المیہ پر ان کے فیچر نے مقبولیت کے ساتھ قومی انعام بھی حاصل کیا۔ اقبال مجید کا ٹی وی پلے ''اب اور نہیں'' لکھنؤ دور درشن سے نشر ہوا جس کی ہدایت کاری انہوں نے خود ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ بھوپال کے ٹی وی مرکز کے لئے اصلاحی فلم ''ہر فن مولیٰ'' کی تحریر اور ہدایت کاری بھی کی۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت مدھیہ پردیش نے انہیں ''شکھر سمان'' سے نوازا۔

ملازمت کی مصروفیات اور اردو ادب سے والہانہ لگاؤ کے باوجود اقبال مجید کی اصل شناخت ان کی فکشن نگاری ہے۔ دراصل ان کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسندی کے عروج کے دور میں ہوا۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کو ایک نئے ادبی رجحان کے طور پر قبول کیا لیکن وہ کسی سیاسی تنظیم کے آلہ کار نہیں رہے یہی وجہ ہے

کہ ان کے ابتدائی افسانے سماجی حقیقت نگاری کے عکاس ہیں۔ انہوں نے پہلا افسانہ ''عدو چچا'' کے عنوان سے لکھا جو 'شاہراہ' دہلی میں شائع ہوا لیکن بحیثیت افسانہ نگار ان کی شناخت ۱۹۶۵ء میں ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' سے ہوئی۔ اور اسی لئے انہوں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ کا نام بھی یہی رکھا۔

اقبال مجید کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔

۱۔ دو بھیگے ہوئے لوگ
۲۔ ایک حلفیہ بیان
۳۔ شہر بدنصیب
۴۔ تماشا گھر
۵۔ آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت

اقبال مجید نے اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ 'انہوں نے علامتوں کا استعمال موضوع کو طاقت دینے کے لئے ایک ٹول کی طرح کیا ہے۔' ان کا خیال ہے کہ بیانیہ اور علامت ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ معاون ہیں۔ انہوں نے وسیم اختر کو دیئے گئے انٹرویو میں یہ تسلیم کیا ہے کہ 'انہوں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضد کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ رجحان [illegible] پیش رو رجحانات کے مقابلے میں کن کن علاقوں [illegible] تازہ دم اور ریلی ونٹ ہے۔' وہ کہتے ہیں کہ ''[illegible] جدیدیت سے صرف اس حد تک متاثر ہوا جس حد تک وہ ہمارے تہذیبی ورثے اور سماجی حقیقتوں کا احترام کرنے کی حالت میں رہی اور ہماری فکشن کی روایت جس کی [illegible]ب صفت حقیقت نگاری تھی۔ دوست بن کر نہ سہی [illegible]ی کی حریف بن کر بھی نہیں کھڑی ہوگی۔''

اقبال مجید کے افسانوں کے مطالعہ سے واضع [ہو]تا ہے کہ انہوں نے بیدی، منٹو، قرۃ العین حیدر، [حیا]ت اللہ انصاری، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی اور [انت]ظار حسین کے اثرات قبول کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں سچی انسانی تڑپ جلوہ گر ہے اور اپنے عہد کے آشوب و ابتلا سے اقدار کے زوال سے برہم و بیزار رہتے ہیں۔ ان کی فکشن کے فن پر دسترس اتنی مضبوط ہے کہ افسانے کو جب، جس طرح اور جہاں چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے بھی اقبال مجید کو قوت مند اور معنی خیز افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔

اقبال مجید کے فکشن کا سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ اپنے ڈکشن اور ماجرائی کیفیت کے فنی اظہار کے ذریعہ ابتدا سے انتہا تک قاری کو اپنے طلسم میں باندھ کر رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''دسترس'' اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں انہوں نے آج کی سوسائٹی میں پلنے والے سم آگیں خوف کو پیش کیا ہے۔ ''شہر بدنصیب'' ان کہانیوں میں قدرے مختلف ہے جو اقبال مجید کے خارجی پیرایۂ اظہار کے ذریعہ انہیں فکشن کی دنیا میں منفرد بنا دیتا ہے۔ ''شہر بدنصیب'' کا اختتام ہے:

''پھر یہ ہوا کہ ایک دن غصے کے گودام سے بو آنا شروع ہوگئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ سارا غصہ سڑ چکا تھا اور شہر کے باسی، تازہ غصہ تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ انسان کو نئی برتری سے روشناس کرانے میں پرانا سڑا ہوا غصہ کام نہیں کر رہا تھا۔''

اقبال مجید کے فکشن کا باطنی نظام فلسفیانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی فکر سے ایسے خیال انگیز بت تراشتے ہیں کہ قاری کو ان کے ساتھ مکالمہ قائم کرنے کے لئے اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کا گہرا سماجی شعور اور دروں بینی انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ نیز سماجی کجروی پر طنز قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اقبال مجید معاشرے کی ناہمواری، طبقاتی تقسیم اور عدم مساوات جیسے موضوعات کے اظہار میں بھی نفسیاتی دروں بینی کو مقدم قرار دیتے ہیں وہ دنیا کی بے ثباتی پر گریہ اور آہ و زاری تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ حوصلہ اور جرأت سے اسے ثبات و قرار کا سرچشمہ بتانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جس کا اعتراف مشہور ترقی پسند ادیب قمر رئیس نے بھی کیا ہے:

''اقبال مجید کسی اور کے نہیں خود اپنے مقلد ہونے کے بھی منکر رہے ہیں۔ نئے شہ زور تجربوں کو زبان دینے کی تڑپ انہیں خود اپنے فن کے حصاروں سے باہر کھینچ لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کم و بیش ہر کہانی میں اظہار و بیان کا کوئی نیا اسلوب اپنے امکانات تلاش کر لیتا ہے اور وہ اس لئے کہ اپنی کہانی میں خواہ وہ کوئی چونکا دینے والی بات نہ کہیں لیکن اپنے عہد کی انسانی صداقتوں کو کسی نئی جہت سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔''

(معلم اردو، لکھنؤ اپریل ۱۹۸۵ء)

درج بالا اقتباس کی تطبیق میں اقبال مجید کے افسانے ''دو بھیگے ہوئے لوگ، مدافعت، پوشاک، سرنگیں، تیرا اور اس کا سچ'' اور ''چیلیں'' پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانہ ''چیلیں'' میں ایک انسان کی زندگی کے کربناک اور انتہائی خوفناک پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اخلاقی زوال، ختم ہوتی ہوئی قدروں کے المیے کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اقبال مجید کی کہانی کا المیہ اپنے لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ کہانی میں جہاں بھرپور تجسس ہے وہیں قرۃ العین حیدر کی طرح تاریخی تسلسل والا وقت بھی ہے۔ افسانہ پانچ برس کے لڑکے کی ساٹھ برس کی عمر تک پہنچنے کی داستان ہے۔ جس میں ظلم، استحصال، گرتی اقدار اور اپنوں کی دی ہوئی ٹیس اور درد کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے المیہ اور بعد میں پاکستان کے اندر رونما ہونے والے ظلم و جبر اور بدعنوانی سے بھرے پُرے ماحول کی طرف واضح اشارے کئے گئے ہیں۔

CamScanner

اقبال مجید نے ''چیل'' کو علامت بنا کر دہشت کا بازار گرم رکھنے والوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ پانچ برس کا لڑکا جو دور آسمان پر کبھی کبھی اڑتی چیلوں کو دیکھا کرتا تھا اور چیل دور ہی سے شکار کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر اس کو موقع نہیں ملتا تھا لیکن لڑکا جب بارہ سال کا ہوتا ہے تو ماحول میں تبدیلی واقع ہونے لگتی ہے اور جب لڑکا اٹھارہ سال کا ہوتا ہے تو ہٹلر کو شکست ہو چکی ہے اور ہندوستان کی تقسیم کا وقت آچکا ہے۔ ماحول میں کشیدگی آ گئی ہے۔ افسانے میں یہاں پر چیل دراصل دہشت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ ماحول اس قدر کشیدہ ہو چلا ہے کہ لوگ بری طرح ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ اقبال مجید نے ان حالات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''انہیں دنوں کسی گلی کوچے میں اگر مزدور بوجھ سے لدے ٹھیلے کے پہیے کو گڈھے سے باہر نکالنے کے لئے بھی زور لگا شور مچاتے تو ان کی آواز پر بھی پڑوس کے لوگوں کے وحشت کے سبب کان کھڑے ہو جایا کرتے، عورتیں آنگن میں جمع ہو جاتیں، مرد چھتوں پر پہنچ جاتے، بوڑھیاں زیور کی پوٹلی بالٹی میں رکھ کر کنویں میں لٹکا دیا کرتیں اور آیۃ الکرسی کا ورد کرنے لگتیں۔''

''چیلیں'' افسانہ میں وقت کے تسلسل کے ساتھ اقبال مجید نے ''چیل'' کے ذریعہ یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج بھی ہندوستانی مسلمان اپنے مہاجر بھائیوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ اقبال مجید نے افسانے کو نقطۂ عروج کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے مذہب کے نام پر تقسیم ہوئے ملک کی اس کسمپرسی کا دیدار کرایا ہے۔ جہاں نہ قدریں ہیں اور نہ ہی ایمان باقی ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ لڑکے کو احساس ہوتا ہے کہ وہ جہاں امان ڈھونڈنے نکلا تھا وہاں تو ہر قدم پر چیلوں کا بسیرا ہے۔ لڑکا غارت گری کے ماحول کے خلاف احتجاج بلند کرنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکام تو خود ان چیل نما دہشت گردوں کو پناہ دیئے ہوئے ہیں۔ آخر ساٹھ برس کی عمر میں وہ ان دہشت گردوں کا نشانہ بن جاتا ہے جو کہ اپنے کو کلمہ گو کہتے ہیں جبکہ ان کو نہ تو دین کا پتہ ہے اور نہ ایمان کا۔ اقبال مجید نے ''چیلیں'' میں نہ صرف یہ کہ تقسیم کے کرب کو بیان کیا ہے بلکہ تقسیم ہی کو غلط ٹھہرایا ہے۔ یہ کہانی بظاہر ایک شخص کی کہانی ہے لیکن اس میں نہ صرف یہ کہ ایک پوری تاریخ پوشیدہ ہے بلکہ بدلتی قدریں اور لہولہان انسانیت کا بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اقبال مجید نے یہ افسانہ ۱۹۹۸ء میں تحریر کیا لیکن جس اچھوتے انداز سے انہوں نے بیانیہ ترتیب دیا ہے وہ انداز انہیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس افسانے میں محض لڑکے کا کردار ہی اہم ہے جس کے اردگرد پورے افسانے کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ افسانے میں واقعات کی ترتیب اور تجسس ان کی فن پر گرفت کی واضح مثال ہے۔ افسانے کا اختتامیہ یہ سوال قائم کرتا ہے کہ جس مذہب نے اخلاق کی بنیاد پر دنیا بھر میں اپنا پرچم بلند کیا اس مذہب کے ماننے والے اسے کس راستے پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جس اسلام کو پیش کر رہے ہیں کیا وہی اسلام ہے جو پیغمبر خاتم نے پیش کیا ہے؟ اقبال مجید کا جواب نفی میں ہے اور یہی صحیح جواب ہے۔ بہ ہر حال موضوع کی پیش کش اور اسلوب کی بنیاد پر ''چیلیں'' اقبال مجید کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔

اقبال مجید کا افسانہ ''ایک رات ایک دن'' متوسط گھرانے کے شادی شدہ جوڑے کی زندگی کے خوبصورت اور تلخ تجربات کا بہترین عکاس ہے۔ متوسط طبقے کا مرد جہاں اپنے آفس کے کاموں میں الجھ کر دن گزارتا ہے تو وہیں اس کی بیوی بچوں کی پرورش اور گھریلو کام میں مصروف رہ کر دن تمام کرتی ہے لیکن رات دونوں کے درمیان کس طرح رشتوں کو مضبوطی عطا کرتی ہے یہی لمحہ اقبال مجید کے افسانے کو خوبصورت فکشن کا روپ دیتا ہے۔ اقبال مجید نے اس افسانے میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے اور مرد کی اس بالا دستی کو بیان کیا ہے کہ عام طور سے متوسط طبقے کا شوہر سمجھتا ہے کہ وہ دن بھر محنت کرتا ہے اور رات میں بیوی سے جنسی تسکین حاصل کرنا اس کا حق ہے، جسے وہ بخوبی وصول کر لیتا ہے لیکن وہ یہ سوچنے سے قاصر ہے کہ اس کی بیوی کا بھی اس پر کچھ حق ہے۔ وہ اس سے جس جذباتی لگاؤ کی امید کرتی ہے شوہر اس سے نابلد ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شروع میں خوبصورت لگنے والی زندگی وقت گزرنے کے ساتھ تلخی کا شکار ہو جاتی ہے۔ شادی شدہ زندگی کے عام مسائل پر اقبال مجید کا یہ افسانہ حالات اور مسائل کو تو بخوبی پیش کرتا ہے لیکن اختتام روایتی ہے۔ یہاں اقبال مجید نے چونکانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ چاہتے تو روز روز کی زن وشو کی تو تو مَیں مَیں کے بعد طلاق وغیرہ کے واقعات پیش کر کے قاری کو مزید تجسس میں مبتلا کر کے چونکا سکتے تھے لیکن انہوں نے کہانی کو فطری انداز میں بیان کر کے افسانے پر اپنی گرفت اور ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے جو افسانے کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اقبال مجید بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں افسانوی دنیا سے متعارف ہوئے اور ان کے افسانے ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' نے ان کی ادبی حیثیت میں چار چاند لگائے لیکن آٹھویں دہائی میں ان کی تخلیقی کیفیت میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بیانیہ کو ہنرمندی عطا کی اور اس دوران تمثیلی اور علامتی افسانے بھی لکھے۔ انہوں نے ''شرمندگی'' افسانے میں سیدھی سادی کہانی پیش کی ہے تو ''ایک حلفیہ بیان'' میں پورا ستعاراتی نظام

موجود ہے۔ افسانے کا مرکز ایک کیڑا ہے جو کہ چکنے فرش پر کبھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی صبر و ضبط کا دامن تھام لیتا ہے۔ کیڑا مظلومیت کا شکار ہے۔ افسانے کا راوی کیڑے کو لے کر ایک فکری پیچ وتاب میں مبتلا ہے۔ اندھیرا، رات اور برسات کے موسم میں ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ایک کیڑا چکنے فرش کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے منزل کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ راوی کیڑے کی ناکامی پر جھلا رہا ہے۔ دراصل افسانے کا راوی کیڑے کو کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ افسانے کا آغاز اور اختتام دونوں حلفیہ بیان سے ہوتا ہے لیکن دونوں میں فرق ہے۔ اقبال مجید اس افسانے میں ایک قوم کی منزل کی طرف بڑھتے قدم کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا راستہ بے حد پر خطر ہے اور چاہنے کے باوجود وہ اس پر چل نہیں پا رہے ہیں۔ جبکہ باہری قوت جوان کی مدد کر سکتی ہے مگر نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ قوت بھی اس کے لئے دعا گو ہے لیکن ناکامی پر اسے مدد کی جگہ راستے میں چھوڑ دیتی ہے۔ اقبال مجید اس افسانے کے ذریعہ اس لاحاصل کوشش سے پنپنے والے المیے کو بیان کرتے ہیں کہ اس المیے میں نہ صرف مظلوم قابل احترام ہے بلکہ ظالم بھی اتنا ہی لائق احترام بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم ظلم کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس کے سبب وہ ظالم بن جاتا ہے۔ یہ ٹریجڈی ہے اس انسان کی جو کہ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو سینے سے لگائے تڑپتا رہتا ہے۔

''پیشاب گھر آگے ہے'' اقبال مجید کا ایک ایسا افسانہ ہے جو ہمارے سسٹم پر تنقید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں راوی کا بیان، مرکزی کردار کے سوالات اور غائب حاضر کے جوابات سے منفرد فضا کی تخلیق ہوتی ہے جبکہ ''ایک حلفیہ بیان، پیٹ کا بچوا، پوشاک، دو بھیگے ہوئے لوگ'' اور ''مدافعت'' وغیرہ افسانے تکنیکی تنوع کی بہترین مثال ہیں۔ ان افسانوں میں داخلیت، خارجیت اور مشاہدہ سب کچھ موجود ہے اور یہ افسانے یکسانیت کا شکار محسوس نہیں ہوتے جبکہ اقبال مجید کے بعض افسانوں میں وقت کا ٹریٹمنٹ بڑھتے ہوئے تناؤ کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے کا افسانہ ''ہائی وے پر ایک درخت'' ہے۔ اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی جعفر نے لکھا ہے کہ ''ہائی وے پر ایک درخت'' پلاٹ اور استعارے کے باہم دگر ہونے کی مثال ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''اقبال مجید کا یہ افسانہ بنیادی طور پر داخلی ذہن کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ خارجی رکاوٹوں اور سیاسی راہوں میں پیدا ہونے والے زہریلے عوامل کا آئینہ بھی ہے۔''

(اقبال کی پلاٹ سازی اور ہائی وے پر ایک درخت: مہدی جعفر: مشمولہ افسانے کی عملی تنقید: مرتب مامون رشید: سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈی شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی: ۲۰۱۶ء: ص ۲۱۹)

اقبال مجید کا یہ افسانہ موجودہ عہد کی سفاکی، غارت گری اور بے ضمیری کی خوبصورت مثال ہے۔ پھانسی کے پھندے پر لٹکنے والا کردار اس افسانے میں آئینہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس لئے کہ جس درخت پر اسے پھانسی دی جا رہی ہے وہ درخت اسی کا پروردہ ہے۔ اقبال مجید کی خوبی یہ ہے کہ اس کہانی سے ابھرنے والی امیجری شفاف اور واضح ہے۔ سارا کا سارا پلاٹ افسانے کے استعاراتی نظام کی بہترین مثال ہے اور اس کی ڈرامائی کیفیت اور اتار چڑھاؤ کا آہنگ اسے قاری سے قریب لے آتا ہے اور اس کی دلچسپی کو مہمیز کرتا ہے۔

اقبال مجید کا ۲۰۱۰ء میں افسانوی مجموعہ ''آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت'' شائع ہوا۔ اس عنوان سے مجموعہ میں ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ جو کہ دلت استحصال اور اس کے سبب دلتوں میں پنپنے والے بدلے کے جذبات کو بے حد فنکارانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ افسانے کا راوی خود کہانی کار ہے اور وہ فلم کی اسکرپٹ لکھنے میں مدد کر رہا ہے۔ وہ دلت استحصال کے خلاف ہے لیکن پروڈیوسر دلت استحصال پر اس لئے فلم بنانا چاہتا ہے کہ اسے مالی منافع ہو۔ ڈائریکٹر دلتوں کی گندی بستی میں پہنچ جاتا ہے اور دلتوں کے مکھیا کے گھر پہنچ کر اس سے گھلنے ملنے کا ناٹک کرتا ہے۔ مکھیا کی بیوی آگ کے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور ڈائریکٹر کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ڈائریکٹر مکھیا سے اس گلاس میں پانی پینے کی ضد کرتا ہے جو اس کے پاس رکھا ہوا ہے لیکن مکھیا اس میں پانی دینے سے منع کرتا ہے۔ ڈائریکٹر کی ضد پر آگ کے پاس بیٹھی مکھیا کی عورت اس گلاس میں پانی کر کے بھجواتی ہے۔ ڈائریکٹر وہ پانی پی لیتا ہے۔ جب وہ مکھیا سے بار بار یہ پوچھتا ہے کہ آخر اس گلاس میں پانی دینے میں کیا قباحت تھی تو مکھیا کہتا ہے:

''اس سے ہماری عورت سور کے بیمار بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے۔''

فلم ڈائرکٹر یہ سن کر سناٹے میں آ جاتا ہے لیکن وہ عورت بے حد اطمینان کا سانس لیتی ہے جیسے کہ اس نے اپنے تمام استحصال کا بدلہ ایک ہی پل میں لے لیا ہو۔ افسانے میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن مکھیا کی بیوی کا کردار بے حد اہم ہو گیا ہے۔ حالانکہ پورے افسانے میں وہ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کرتی لیکن اس کی چند حرکات اس کے کردار کی اہمیت کو واضح کر دیتی ہیں۔ افسانے میں ڈرامائی پیشکش قاری کے تجسس کو برقرار رکھتا ہے۔ اقبال مجید کا یہ افسانہ دلت مسائل پر لکھے گئے افسانوں میں ایک کامیاب افسانہ ہے اور ایسے ہی افسانے اقبال مجید کو اعلیٰ فنکار کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

□□□